لفظ قصیدہ کے معنی پُر مغز کے ہیں۔ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ قصیدہ لفظ قصد سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'ارادہ' چونکہ پوری نظم ایک ہی ارادہ سے لکھی جاتی ہے اس لیے یہ نام دیا گیا ہے۔ اصطلاح میں قصیدہ سے مراد وہ نظم ہے جو مدح وذم کے لیے مستعمل ہو۔ قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اور دیگر اشعار میں صرف مصرع ثانی میں قافیہ کا اہتمام کیا جاتا ہے قصیدہ اپنی ہیئت ہی سے اپنی شناخت برقرار رکھ سکا ہے۔ اگر اس کی یہ ہیئت بدل جائے تو قصیدہ بھی اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔غزل اور قصیدہ کی تکنیک ایک جیسی ہے یہ بھی خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ غزل قصیدہ کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔

یوں تو قصیدہ مدح وذم کے لئے مخصوص ہے لیکن کسی کی مدح سرائی اس انداز سے کرنا کہ اس میں ایک ادبی شان پیدا ہو جائے بڑا ہی دقیق اور مشکل کام ہے اس کے لیے زبان پر قدرت تخیل کی بلندی، طبعیت کی روانی، جودت طبع اور ایک خاص مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ بہت کم شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ معنوی اعتبار سے قصیدہ کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جن میں خدا کی حمد، نعت رسول، منقبت اہلِ بیت، یا ولیوں اور صوفیوں کی مدحت کی جاتی ہے ایسے قصیدوں میں ایک مذہبی رنگ جھلکتا ہے اور عقیدت کا اظہار نہایت ہی اچھوتے اور موثر انداز میں کیا جاتا ہے۔قصیدہ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں کسی فرمانروا، بادشاہ، امیر یا وزیر کی مدح کی جاتی ہے۔ایسے شخصی قصیدے درباری ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ان میں بلا کا تکلف اور تصنع ہوتا ہے۔

قصیدہ ادب کی شان ہے اس میں رعب داب، شان وشوکت، دبدبہ اور وجاہت کا احساس ملتا ہے اور اس کے لئے مناسب الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ایسے الفاظ جو وجیہ اور پرشکوہ ہوتے ہیں۔قصیدہ کی فضا میں ایک طنطنہ، طمطراق اور تکلف کا احساس ہوتا ہے۔نظم کی طرح قصیدے میں خیالات ومضامین مربوط اور مسلسل ہوتے ہیں۔

2 عربی وفارسی میں قصیدہ نگاری :

قصیدہ عرب کی پیداوار ہے اور فارسی کے توسط سے اردو میں آیا ہے عرب میں اس کا رنگ بالکل جداگانہ تھا۔عرب کی شاعری میں وہاں کی سیرت جھلکتی ہے شجاعت، سخاوت، مہمان نوازی اور الفت ومحبت کو نہایت سادہ لیکن دلکش اور موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے عربوں کی زندگی میں شاعری کا بہت دخل تھا۔ ہر سال مخصوص دنوں میں شہر عکاظ میں ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا عرب کے مختلف قبائل وہاں جمع ہوتے تھے اور ہر قبیلہ کا شاعر وہاں اپنا کلام سناتا تھا! اور ان میں سے بہترین قصیدہ کو چُن کر کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیا جاتا تھا۔ایسے ہی سات قصیدے 'سبع معلقات' کے نام سے موسوم ہیں۔آج بھی ان قصیدوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔عرب میں قصیدہ نگار اپنے ذاتی احساسات، تجربات روزمرہ کے واقعات، قومی وملکی حالات، مناظر فطرت اور عشق کی واردات بیان کرتا ہے۔ ہر چند کے قصیدہ مدح وذم کے لیے مخصوص ہے اس میں دیگر مختلف قسم کے مضامین بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اخلاقی مضامین، پندونصائح، گردشِ زمانہ، موسم بہار کی کیفیت اور دیگر موضوعات بھی قصیدہ میں پیش کیے گئے ہیں۔عرب میں اکثر قصیدہ کی ابتدا محبوب کے حسن کی تعریف سے ہوتی ہے شاعر فطری انداز میں بڑا ہی لطف اور دلکش تشبیہات کے ذریعہ محبوب کے حسن کی تعریف بیان کرتا ہے اس میں تصنع تکلف اور پُرکاری

کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اگر کسی شخص کی تعریف وتوصیف بھی ہوتی ہے تو اس میں سچائی اور حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ حقیقت نگاری اور سادگی عربی قصیدوں کی اہم خصوصیت ہے۔

جب قصیدہ ایران پہونچا تو اسی حقیقت نگاری اور سادگی کا حامل تھا لیکن یہاں کی درباری فضا میں اس پر ایسی ملمع کاری ہوئی اور تصنع اور تکلف کا ایسا رنگ چڑھا، غلو اور مبالغہ نے اس پر ایسا اثر ڈالا کہ اس کی صورت ہی بدل گئی۔ قصیدہ ایران میں بہت ترقی کر گیا۔ یہاں قصیدہ نگاروں کی ایسی قدر دانی اور عزت افزائی ہوئی کہ یہاں خاقانی، ظہوری، رودکی، نظیری، انوری اور قاآنی اور فارابی جیسے عظیم شاعروں نے اپنے فن کا جادو جگایا اور ایسے عظیم قصیدے لکھے کہ جن کی عظمت کے آگے ساری دنیا سر جھکاتی ہے۔ ایران میں قصیدہ نگاروں کی کافی ہمت افزائی ہوئی لیکن جب حکومت کی باگ صفوی خاندان میں آئی تو ان کا شیعی میلان اتنا شدید تھا کہ یہ اپنی مدح کی بجائے اہل بیت کی مدح پسند کرتے تھے۔ پھر یہاں سے قصیدے کا زوال شروع ہو گیا۔ اردو میں جب قصیدہ رائج ہوا تو اسے فارسی کے عظیم شاہکار فن پاروں کی قیادت نصیب ہوئی۔

3 اجزائے ترکیبی :

قصیدہ میں چونکہ شاعر کو اپنے فن کا کمال دکھانا مقصود ہوتا ہے اس کے لیے وہ نہایت ہی سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کرتا ہے بے حد دقیق اور مشکل قافیہ استعمال کرتا ہے اور مضمون آفرینی کا کمال دکھاتا ہے۔ قصیدہ کے پانچ جز ہیں (1) تشبیب (2) گریز (3) مدح (4) حسن طلب (5) دعا۔

(1) تشبیب : یہ قصیدہ کی تمہید ہوتی ہے اسے نشیب بھی کہا گیا ہے اس کے تعلق سے عابد علی عابد یوں رقمطراز ہیں۔ ''تشبیب کے لغوی معنی احوال ایام شباب کردن ہیں عرب کے قصائد میں یہی صورتحال تھی پھر یہ ضروری نہیں رہا کہ قصیدہ کی ابتدا صرف عشقیہ کوائف سے ہو..... عرب میں شاعر تشبیب میں رسماً داستان عاشقی بیان کرتا یا واقعاً اپنی زندگی کے خاص گوشوں سے پردہ اٹھاتا تھا۔ یہ نہیں تو صحرا کا ذکر کرتا تھا، کبھی مناظر طبعی کا ذکر کرتا تو ہوائے سرد، کھجوروں کے جھنڈ اور آب جو سے آگے نہیں بڑھا..... ابتدا میں عرب شاعری بشمول قصیدے کے بدوی زندگی سے مخصوص تھی۔ قصیدہ جب ایران پہنچا تو یہاں کے شاعروں نے تشبیب میں عاشقی کوائف کی قید آزادی، مناظر طبعی سے لے کر محافل عیش وانبساط تک، دقایق حکمت سے لے کر واردات محبت تک سبھی چیزون کو تشبیب کا موضوع بنایا جیسے :

بُوئے جوئے مولیاں آید ہمی
یاد یار مہربان آید ہمی

(رودکی)

ایوان مدائن را آئینہ عبرت داں

(فاقآنی)

اردو میں شاعر قصیدہ کی ابتدا یا تو غزل کے اشعار سے کرتا ہے یا موسم بہار کی تعریف سے۔غزل کے اشعار سے قصیدہ کی ابتدا ہوتی ہے ان میں عشق وعاشقی کے واقعات، واردات قلب، فلسفیانہ مضامین یا تصوف کے نکات کا بیان ہوتا ہے غالب نے اپنے ایک قصیدہ کی ابتدا ان اشعار سے کی ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

جس قصیدہ کی ابتدا شاعر بہار کی تعریف سے کرتا ہے اُسے بہاریہ تشبیب کہتے ہیں ذوقؔ کے ایک قصیدہ کی تشبیب ہے۔

واہ واہ کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم باد بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دار شفا

شمیم احمد صاحب کا قول ہے کہ تشبیب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں بیان کردہ مضامین ممدوح کے منصب کے نہ صرف مطابق ہوں بلکہ آنے والے مدحیہ اشعار سے معنوی ربط ومناسبت بھی رکھتے ہوں۔اس کے اشعار کی تعداد مدح کے اشعار سے زیادہ نہ ہولیکن اس اصول کی اکثر شاعروں نے پابندی نہیں کی ہے، غالب اور مومن کے قصیدوں میں مدح کے اشعار بہت کم ہوتے ہیں۔

(2) گریز : یہ تشبیب اور مدح کے درمیان کی منطقی کڑی ہے۔شاعر موسم بہار کی تعریف کرتے یا غزل کے اشعار کہتے کہتے اپنے اصل موضوع یعنی اپنے ممدوح کی مدح کی طرف پلٹتا ہے اور اس کے لیے ایک دو اشعار میں جواز پیش کرتا ہے۔مصحفی موسم باراں کی تعریف کرتے ہوئے نواب آصف الدولہ کی مدح کے لیے یوں جواز پیش کرتے ہیں۔

بسکہ رہتا ہے سماں صبح کا تا چاشت؟
آنکھ جب کھلتی ہے سوتے سے کہ دن جائے ڈھل
عشق کرتا ہے زبس دامن پرہیز کو چاک
عیش وعشرت کے مہیا ہیں سب ارباب دول

تانے رہتی ہے سدا کالی گھٹا دل بادل
آصف الدولہ کہ بارانِ سخا سے جس کے
دشت تادشت تروتازہ ہیں صحرا وجبل

گریز کے لئے اصطلاح میں دوسرکش بیلوں کوایک جوے میں جوتنے کے معنی میں لیا گیا ہے جوکہ نہایت ہی مہارت کی بات ہے۔

(3) مدح : یہاں شاعر اپنے ممدوح کی جی کھول کر مدح سرائی کرتا ہے اس میں اپنا سارا زور بیان صرف کر دیتا ہے۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے، تخیل کو بے لگام چھوڑ دیتا ہے اور اس حد تک مبالغہ کرتا ہے کہ غلو کی حدوں کو پار کر جاتا ہے۔ کسی حد تک مبالغہ کسی بھی شعر کو دلفریب بنا دیتا ہے۔ لیکن قصیدہ میں چاہے کتنا ہی بڑھ کر کیوں نہ ہو مبالغہ اس کی شان بن جاتا ہے۔ دراصل شاعر اس کے ذریعہ اپنے تخیل کی پرواز سے نئے نئے معنی تلاش کرتا ہے اور معنی آفرینی کا کمال دکھاتا ہے۔ اور شاعر کو اس کے فن کی اسی صلاحیت کی داد دی جاتی ہے۔ ذوق بہادر شاہ ظفر کی شان میں جو کہ ایک ایسا بدنصیب بادشاہ ہے کہ اس کی حکومت صرف لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اس طرح رطب اللسان ہیں۔

یوں کرسیِ زر پر ہے تیری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سر رحل طلائی
رکھتا ہے تو وہ دست سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہر گدائی
گمرہ کو ہدایت جو تیری راہ پہ لائے
رہزن بھی اگر ہوتو کرے راہ نمائی
تا ناخن شمشیر نہ ہو ناخن تدبیر
دشمن کی تری ہو نہ کبھی عقدہ کشائی
خورشید سے افزوں ہے نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی تری ناصیہ سائی

(4) حسن طلب : یہاں شاعر نہایت ہی لطیف وجمیل انداز میں اپنے ممدوح سے اپنے لئے کچھ طلب کرتا ہے۔ اکثر قصیدوں میں یہ جز نہیں ہوتا۔

(5) دعائیہ : آخر میں شاعر اپنے ممدوح کے لئے دعا کرتا ہے۔ ذوق اپنے ایک قصیدہ میں ممدوح کے لئے یوں دعا کرتے ہیں۔

ختم کرتا ہے ثناتیری دعا پر اب ذوق
کہ زباں کو بس اب آگے نہیں یارائے بیاں
تجھ کو یہ جشن مبارک ہو بصد جاہ وجلال
عقل ہو پیر تری بخت رہیں تیرے جواں
جو دعا گو ہیں ان کی دعائیں ہوں قبول
صبح جشن طرب افزا میں ہوں دائم خنداں
اور برنگ شب دیجور ترے سب بدخواہ
روسیہ محفل عالم میں ہوں جوں ماتمیاں

4 قصیدہ کے اقسام :

قصیدے کی دو اہم قسمیں ہیں۔(1) تمہیدیہ (2) خطابیہ

(1) تمہیدیہ : قصیدہ وہ ہے جس میں مدح کے علاوہ تشبیب، گریز اور دعا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

(2) خطابیہ : ایک ایسا قصیدہ جس میں تشبیب اور گریز کے اجزا نہیں ہوتے بلکہ شاعر براہ راست مدح سے قصیدہ کی ابتدا کرتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے بھی قصیدہ کی کئی قسمیں ہیں

(1) مدحیہ۔جس میں کسی کی مدح کی جائے

(2) ہجویہ۔جس میں کسی کی مذمت، برائی کی گئی ہو یا اپنی مصیبتوں کا ذکر اور زمانہ کی شکایت ہو اس کی عمدہ مثال سودا کا مشہور قصیدہ ''تضحیک روزگار'' ہے۔

(3) وعظیہ ۔جس میں پند و نصائح کے مضامین بیان کیے گئے ہوں مثلاً

اولاً یہ کہ مجالس میں زباں دانوں کی
تیرے آگے جو پڑھے کوئی سخنور اشعار
سخن ایسا نہ ہو سرزد کہ دل اس کا ہو دونیم
گوہو وے تیغ زباں کا تری جوہر اشعار
دوئمی یہ جو تو چاہے کہ نہ مجھ سا ہو کوئی
شعر سے میرے کسی کے نہ ہوں بہتر اشعار

اسی طرح تشبیب کے موضوعات کی بنا پر قصیدہ کے کئی اقسام متعین کیے گئے ہیں جیسے بہاریہ، عشقیہ، حالیہ، فخریہ، وغیرہ۔

5 اُردو میں قصیدہ نگاری :

اردو ادب کی ابتدا ہی سے قصیدہ اس میں شامل رہا اردو کو ادبی حیثیت دکن میں ملی۔ خواجہ حسن گنگو نے بہمنی سلطنت قائم کی اور اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ یہیں سے اردو میں باقاعدہ تحریری کام کا سلسلہ چل نکلا۔ بہمنی سلطنت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ یہ پھیلی بڑھی اور پھر پانچ سلطنتوں میں بٹ گئی ان میں گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومت اردو کے فروغ میں بہت اہم ہیں۔ یہاں کئی ایک اہم شاعر اور ادیب پیدا ہوئے اور یہاں کے فرمانروا بھی خود یا تو شاعر تھے یا علم نواز تھے۔ اسی لئے اردو ادب کی یہاں بہت ترقی ہوئی۔ ابتداء میں اردو میں لکھنے والے فارسی ہی کے ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے اردو کو بھی فارسی ہی کے قالب میں ڈھالا اور وہ سارے اصناف جو فارسی میں رائج تھے جیسے غزل مثنوی، مرثیہ، قصیدہ اور رباعی وغیرہ کو اردو میں بھی رائج کیا۔ قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا جاتا ہے اس کے علاوہ شاہی غواصی، ابن نشاطی، نصرتی، اور وجہی جیسے بہت سارے شاعروں نے دکن میں اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچایا۔ ان میں سے اکثر نے دیگر اصناف کے ساتھ قصیدہ گوئی پر بھی توجہ کی اردو قصیدہ کے اولین نمونے دکن ہی میں ملتے ہیں۔ یہاں کے قصیدوں میں بھی قصیدہ کی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ ان میں قدامت کا احساس ہوتا ہے اور مقامی اثرات بھی بہت واضح ہیں۔ محمد قطب شاہ کے قصیدہ کے چند شعر ہیں۔

وہیں ناریل کے پھل یوں زمردمرتباناں جوں
ہور اس کے تاج کو کہنا ہے پیالہ کر دھن سارا
صفت کرنے کوں سوسن بھی کھلیا ہے اس زباں اپنی
دھن سب سندریاں کے تیں کھلیا نرگس نمن سارا
چمن آواز سن بلبل آپس میں آپ الاپے ہیں
سوتس آواز سن حوراں کریں رقصاں اپن سارا
دیکھت رکھ مست ہودستک بجاویں پات ہاتاں سوں
سوڈالیاں ڈلتے ہو متوال پی پھول ابر ہن سارا

یوں تو اردو شاعری نے ہر قدم پر فارسی شاعری کا اتباع کیا ہے اسی لئے اردو شاعری میں ہندوستانی رنگ کم ہی دکھائی دیتا ہے لیکن دکن میں شاعروں نے مقامی رنگ برقرار رکھا ہے اور یہاں کی شاعری میں ایک عجیب سی رومانیت کا احساس ہوتا ہے۔ قصیدہ میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے۔ شاہی کا ایک قصیدہ ہے۔

چندر تو نکلیا کہ نگٹ اس شش جہت کو مڑلیا
تاریاں سونہ منظر کوں نس آئینہ بندی سب کری
اول سورج کی آگ پواندھار اجّل کیا
صلبلہ ہوا کا فورکا بعد از فلک ست مجمری

دکن اردو ادب کا اولین مرکز رہا۔ یہاں کئی ادبی شاہکار لکھے گئے۔ ان میں سب رس، پھول بن، سیف الملوک و بدیع الجمال، علی نامہ، جیسی بہترین تصانیف قابل ذکر ہیں۔ اس طرح غزل، مثنوی، مرثیہ اور قصیدوں کا بیش بہا خزانہ یہاں جمع ہوگیا۔ دکنی ادب کا یہ عظیم سرمایہ فنی اور تاریخی حیثیت سے اردو ادب میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پھر زمانے کے انقلابات نے اردو کے مرکز کو شمال میں منتقل کر دیا۔ ہوا یوں کہ مغلیہ سلطنت بہت کمزور ہوگئی اور انگریزوں نے سیاسی بدحالی کا فائدہ اٹھایا اور سارے ملک پر قابض ہوگئے اور ملک کا سارا نظم ونسق ان کے ہاتھوں میں آ گیا۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے فارسی کی اہمیت ختم ہوگئی اب ایک ایسی زبان کی جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جائے ضرورت محسوس ہوئی لنگوافرنیکا کی تلاش میں اردو، سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ شمالی ہند کے اکثر شاعر اور ادیب جو فارسی میں بہت نام پیدا کر چکے تھے اب اردو کی طرف متوجہ ہوئے آبرو، ناجی رنگین نے اردو میں لکھنے کی ترغیب دی۔ حاتم، فغاں اور یکرنگ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ پھر وہ دور آ گیا جسے اردو ادب کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ یعنی میر اور سودا جیسے شاعروں نے اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اردو ادب کو ایک ایسے دور میں فروغ حاصل ہوا جبکہ ملک کے سیاسی حالات ابتر تھے۔ معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ بے یقینی زمانہ کا مزاج بن گئی تھی۔ طوائف الملکی کا عالم تھا، مستقبل غیر یقینی اور تاریک نظر آ رہا تھا۔ ایسا ماحول عظیم ادب کی تخلیق کے لئے مناسب نہیں ہوتا لیکن اردو زبان کی نرالی خصوصیت ہے کہ ایسے ماحول میں بھی اس میں عظیم الشان ادب تخلیق ہوا۔ البتہ اس پر اتنا اثر ضرور ہوا کہ مجموعی اعتبار سے اس پر ایک پژمردگی اور افسردگی کی چھاپ پڑ گئی۔ میر کی قنوطیت اس کی واضح مثال ہے۔ سودا میر کے ہم عصر تھے۔ اسی ماحول کے پروردہ اور انھیں حلات سے متاثر ہونے کے باوجود ان کی شاعری میں رجائیت کا احساس ملتا ہے۔ دراصل ان کی فطرت میں بلا کی شوخی تھی اور ان کی ذاتی زندگی رنج وغم سے دور تھی۔ اس زمانہ کا ماحول کافی بگڑا ہوا تھا۔ اخلاقی اقدار پر کاری ضرب لگی تھی۔ فحش گوئی اور دشنام طرازی کا چلن عام تھا۔ ہجونگاری کا دور دورہ تھا۔ اس ماحول میں سودا کے مزاج کی شگفتگی اور بے پناہ شعری صلاحیتوں نے انہیں بھی ہجو لکھنے پر آمادہ کیا شخصی ہجویات کے ساتھ ساتھ انھوں نے زمانہ کی بدحالی کو بھی نشان ملامت بنایا ہے۔ تضحیک روزگار، اور شہر آشوب، اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کی طبیعت کا فطری میلان قصیدہ گوئی کی طرف تھا اور انھوں نے ایسے لاجواب قصیدہ لکھے ہیں کہ حقیقت میں قصیدہ گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے قصیدوں میں فارسی کے عظیم شاعر نظیری کے قصیدوں کی سی شان نظر آتی ہے۔ زور بیان، تخیل کی بلندی، ضائع و بدائع کا برمحل استعمال شان وشوکت اور رعب و دبدبہ کی کیفیت، وجیہ اور پرشکوہ الفاظ کا ماہرانہ استعمال ان کے قصیدوں کی خصوصیت ہے۔ نواب عمادالملک، آصف جاہ نظام الملک کی

تجھ سے ممنوں نہ فقط روئے زمیں پر ہر یک
بار احساں سے تیرے ہے دوتا پشت فلک
ہوگر بار جو تجھ آتے سحاب نیساں
برق ہو کر متبسم اسے مارے چشمک
آگے اس بحر کرم کے صدف پر گوہر
مٹھی اس کی ہے جیسے نکلے بہ شدت چیچک
چل سکے ہے نہ کسی امر میں تدبیر حکیم
مہر سے رائے کے تیرے وہ نہ لے تا دستک

حضرت علیؓ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی تشبیب یوں لکھی ہے۔

اٹھ گیا بھمن ودے عمل کا چمنستان سے
تیغ ازدی نے کیا ملک خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عزوجل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل
واسطے خلوت نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

سودا کی بے پناہ شعری صلاحیت ان کے قصیدوں میں بخوبی نمایاں ہے۔اسی لئے انھیں اردو کا عظیم ترین قصیدہ گو قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور کے بہت سارے شعرا نے بھی قصیدے لکھے ہیں۔اودھ میں نواب آصف الدولہ کی قدردانی نے بہت سارے شاعروں کو لکھنؤ چلے آنے پر آمادہ کیا نواب آصف الدولہ نہایت علم دوست شعروفن کے دلدادہ اور بہت ہی سخی انسان تھے۔انھیں اوصاف نے شاعروں کو ان کی مدح سرائی پر مائل کیا۔ یہاں تک کہ میر جیسے خوددار اور تنگ مزاج انسان نے بھی ان کی مدح سرائی کی ہے اور ان کی شان میں قصیدہ لکھا ہے۔اس زمانہ میں لکھنؤ اردو کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔قصیدہ گوئی کی ایک روایت سی قائم ہوگئی تھی۔مغلیہ سلطنت آخری سانسیں لے رہی تھی۔بہادر شاہ ظفر برائے نام شہنشاہ تھے۔اس کے باوجود غالب ذوق جیسے شاعران کے دربار سے وابستہ ہونے اور استاد شاہ کہلانے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے اور ان کی شان میں قصیدے لکھا کرتے تھے اس دور کے شاعروں میں مومن، ذوق اور غالب کے قصیدے

بہت مشہور ہیں۔ غالب اور مومن کی طبیعت کا قدرتی میلان قصیدہ نگاری کی طرف نہیں تھا البتہ ذوق نے لاجواب قصیدے لکھے ہیں بلکہ انہوں نے صحیح معنوں میں قصیدہ نگاری کا حق ادا کیا ہے ان کے قصیدے فن قصیدہ نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ انھیں خاقانی ہند کے لقب سے نواز اگیا۔ اکبر شاہ ثانی جو کہ مغلیہ سلطنت کا ایک انتہائی کمزور شہنشاہ تھا اس کی مدح میں یوں رقمطراز ہیں۔

ماہ فرخندہ لقب شاہ محمد اکبر
تاج شاہان زمیں فخر سلاطین جہاں
دیکھا ہے دولت وصولت کا جو اس کے اقبال
دہر سرکش کا بھی قد ہوگیا خم مثل کماں
مدح حاضر کے لئے حاضر دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانی ہند اور وہ خاقان جہاں

ایک اور قصیدہ میں جو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے لکھتے ہیں۔

لے کے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی
اٹھی ملتی ہوی آنکھوں کو کہیں اپنی للت
چشم سرمست مئے ناز میں کاجل پھیلا
لب مئے گوں پہ مسی کی پڑی پھیکی رنگت
بے نمک آیا نظر حسن مہ انجم چرخ
ہوگیا زرد رخ شمع و چراغ خلوت
چونکے مرغ سحری عرش سے آواز خروس
ہوگئی خواب کو آوازۂ کوس رحلت

اردو میں قصیدہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے اور اس میں قصیدوں کا بیش بہا خزانہ موجود ہے بیسویں صدی کی ابتداء میں یوں تو بہت سارے شاعروں نے قصیدے لکھے ہیں ان میں امیر، منیر، داغ، جلال اور محسن بہت ہی اہم قصیدہ گو قرار دیے جاسکتے ہیں۔ خصوصیت سے محسن کاکوروی کا نعتیہ قصیدہ، مدیح خیر المرسلینؐ، اردو میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تشبیب نہایت نرالی ہے :

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل

جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول عمل
خبر اڑتی ہوی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کی ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

یہ بہاریہ تشبیب ہندوستان کے اساطیری ماحول کی ترجمانی کرتی ہے۔اس قصیدہ کا ماحول خالص ہندوستانی ہےاسی لئے قاری کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اس میں شاعر نے نوروظلمت اور باران رحمت کا استعمال بڑے ہی بلیغ انداز میں کیا ہے۔کفروالحاد کی تاریکی اورنوراسلام کی نہایت ہی پرلطف اور جمیل انداز میں ترجمانی کی ہے اور مدح رسول میں توقلم کی روانی نے وہ کمال دکھایا ہے کہ ہر سرعقیدت سے جھک جاتا ہے۔معراج کاذکرکس قدرکیف انگیز ہے۔

تھا بندھا تار فرشتوں کا در اقدس پر
شب معراج میں تھا عرش معلیٰ بادل
آمد ورفت میں تھا ہم قدم برق بُراق
مرغزار چمن عالم بالا بادل
ہفت اقلیم میں اس دیں کا بجایا ڈنکا
تھا تری عام رسالت کا گرجتا بادل
دین اسلام تری تیغ دو دم سے چمکا
یا اٹھا قبلے سے دیتا ہوا کاندھا بادل
آستانے کا ترے دہر میں وہ رتبہ ہے
کہ جو نکلا تو جھکائے ہوئے کاندھا بادل
تو وہ فیاض ہے در پر ترے سائل کی طرح
فلک پیر کو لایا دینے کاندھا بادل
تیغ میدان شجاعت میں چمکتی بجلی
ہاتھ گلزار سخاوت میں برستا بادل
محسن اب کیجئے گلزار مناجات کی سیر

کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھر تا بادل

محسن کاکوروی کے علاوہ اس دور میں نظم، صفی، عزیز، محشر، سہیل، وغیرہ نے بھی بہت اچھے قصیدے لکھے ہیں۔

6 اختتامیہ :

قصیدہ اپنی گونا گوں خصوصیات کی وجہ سے اردو کی ایک بہت ہی اہم صنف سخن ہے۔ اس میں شاعری کا فن کمال پر پہنچا نظر آتا ہے۔ وقت کی گردش نے آج اس عظیم صنف کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے آج اس کی صرف ایک تاریخی حیثیت باقی رہ گئی ہے۔ اب نہ وہ زمانہ رہا اور نہ وہ لوگ رہے بدلتے ہوئے وقت نے انسان کی زندگی کو تیز رفتار بنا دیا ہے۔ آج انسان نہایت آرام طلب اور سہل پسند بن گیا ہے۔ اب نہ کسی کے پاس اتنا وقت ہے کہ ساری زندگی شعر و شاعری کے لئے وقف کردے اور نہ ہی وہ مشکل پسند طبیعتیں باقی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قصیدہ وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ کچھ بھی ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ تاریخی اعتبار ہی سے سہی اردو کے طالب علم کو قصیدہ کا مطالعہ لازمی ہے اس کے بغیر شاعری کا مطالعہ نا تمام اور نامکمل ہے۔ یوں تو آج بھی مدحیہ نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن ان میں قصیدہ کی وہ شان باقی نہیں ہے۔ قصیدوں میں یوں تو بے پناہ مبالغہ سے مدح سرائی ہوتی ہے لیکن ان میں اس دور کے معاشرتی انداز اور تہذیبی پہلو بھی اجاگر ہوتے ہیں جن کا مطالعہ ادب کے طالب علم کے لئے بہت اہم ہوتا ہے۔

7 ذوق کے ایک قصیدے کا جائزہ

اگر ذوق کا قصیدہ جو عیدالفطر کے موقع پر انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو پیش کیا ہے پڑھا جائے تو پہلے اس کی تشبیب کی اہمیت سمجھنی ہوگی اور اس میں موسم باراں کا جو پرلطف منظر کھینچا گیا ہے اسے دیکھنا ہوگا۔

قصیدہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

اس مرتبہ عیدالفطر موسم برسات میں واقع ہوئی ہے عید کی خوشی اور پھر موسم برسات جو کہ مے خوارون کو پینے کی خواہش کو شدید کر دیتا ہے۔ یہاں دونوں کے یکجا ہونے سے مے خواروں کی قسمت کھل چکی ہے۔ پھر ذوق نے چند اشعار میں مے خوری کے تعلق سے بڑی ہی پرتکلف باتیں بیان کی ہیں۔ اور پھر موسم باراں کی ترجمانی یوں کی ہے۔

یہ جوش ہے باراں کا افلاک کے نیچے
ہووے نہ ممیز کرہ ناری دمائی
پہنچا کمک لشکر باراں سے ہے یہ زور
[illegible] چڑھائی

ہو قلزم عماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

برسات کا زور اتنا زیادہ ہے اور پانی کی اس قدر بہتات ہے کہ اب آگ کے کرہ اور پانی کے کرہ میں فرق تک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سب پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔اور برسات کے پانی کا ایسا زور ہے کہ ایسا لگتا ہے جنگل میں ہر نالہ دریا پہ چڑھائی کر دے گا۔اتنا ہی نہیں ایک چھوٹی سی نہر قلزم عماں کی ہنسی اڑاتی ہے اور تالاب سمندر سے آنکھ ملانے لگ گیا ہے اور پھر نہایت ہی مبالغہ سے برسات کا عالم اور اس سے قوت نمو میں جو ترقی ہوئی اس کا ذکر کیا ہے اور اس میں ایسے ایسے نئے مضامین باندھے ہیں کہ عقل حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ جیسے معشوق کے ہاتھ کے حنا کی سردی عاشق کے جگر تک پہنچ جاتی ہے۔کانٹے دار صحرا میں اب سبز مخمل کا فرش بچھا ہے۔نرگس شہلا نے آنکھ میں کاجل لگایا ہے گل سوسن نے لبوں پہ دھڑی جمائی ہے۔ یہاں تک کہ دیوار چمن پر بنی ہوئی تصویر نغمہ سرائی کرتی نظر آتی ہے۔

پھر شاعر ایک خوبصورت شعر سے اپنے اصل موضوع یعنی ممدوح کی تعریف وتوصیف کی طرف پلٹتا ہے۔گریز کا یہ شعر نہایت بلیغ ہے۔

شاہا ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

پھر شاعر ممدوح کی مدح سرائی کرتا ہے اور اس میں تخیل کی اڑان کمال کے درجہ پر نظر آتی ہے۔ایسے ایسے مضامین بیان کرتا ہے اور ایسے نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے جن کا کوئی جواب نہیں۔مثلاً بادشاہ کے علم کی وسعت یوں بیان کرتا ہے۔

کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہوسکے کا سے میں سمائی

اور پھر بادشاہ کے اوصاف میں زمین،آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔

رکھتا ہے تو وہ دست سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہر گدائی
گمرہ کو ہدایت جو تیری راہ پہ لائے
رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی
خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی تری ناصیہ سائی

بادشاہ کی سخاوت کا یہ عالم ہے کہ سمندر میں تیرتی ہوئی کشتی یوں معلوم ہوتی ہے جیسے سمندر بھیک کی کشتی لئے اس کے آگے بھیک مانگ رہا ہے۔اس کے رشد وہدایت کا یہ عالم ہے کہ اگر رہزن کو بھی ہدایت دیتا ہے تو وہ راہ نمائی کرنے لگتا ہے۔اور آسماں اگر اس کے در پہ پیشانی جھکاتا ہے تو اس کے پیشانی کا داغ سورج سے بھی زیادہ چمکدار ہو جائے گا۔

آخر میں شاعر دعا کرتا ہے اور اس پر قصیدہ کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ہر سال شہا ہودے مبارک یہ تجھے عید
تو مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی